بھی۔دشمن سے نجات حاصل کرنے میں یہ عقبہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر دشمن سے اپنے آپ کو بچالے یا پھر گھاٹی میں داخل ہو کر کہیں نکل جائے۔اس جگہ طاعات وعبادات کو عقبہ سے تعبیر فرمایا ہے جس طرح عقبہ دشمن سے نجات دلانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پھر ان اعمال صالحہ میں پہلے فرمایا کسی غلام (یا مقروض) کو آزاد کرنا۔ یہ بہت بڑی عبادت ہے اور ایک انسان کی زندگی کو سنوار دینا ہے۔دوسری چیز بیان فرمائی بھوکے کو کھانا کھلانا۔کسی کو بھی کھانا کھلایا جائے وہ ثواب سے خالی نہیں ہے، لیکن جب کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے تو اس میں دوہرا ثواب ہو گیا۔ایک بھوکے کا پیٹ بھرنا دوسرے صلہ رحمی کا حق ادا کرنا۔اگر یتیم رشتہ دار نہ ہو تو ایسا مسکین ہو جو محتاج ہو۔(معارف القرآن)

نوٹ:6

آیت۔17۔کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن بھی ہو۔کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل نہ تو عمل صالح ہے اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابل قبول اور ذریعہ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔مثلاً سورۂ نساء کی آیت۔124۔میں فرمایا کہ جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔سورۂ نحل کی آیت۔97۔میں فرمایا کہ جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو ان کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔ جو شخص بھی قرآن پاک کا مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے اجر کا ذکر ہے وہاں لازماً اس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ایمان کے بغیر عمل کو قرآن میں کہیں بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا اور نہ اس پر کسی اجر کی امید دلائی گئی۔
(تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الشمس (91)

آیت نمبر (1 تا 15)

ط ح ی

(ض) طَحۡیًا کسی چیز کو پھیلانا۔زیر مطالعہ آیت۔6۔

ل ھ م

(س) لَھۡمًا کسی چیز کو ایک ہی مرتبہ میں نگل جانا۔ہڑپ کر جانا۔

(افعال) اِلۡھَامًا نگلوانا۔کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا۔(لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القا کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے دل میں ڈالی جاتی ہے۔مفردات) زیر مطالعہ آیت۔8۔

ترکیب

آیات۔5 تا 7 میں مَا کا لفظ آیا ہے۔اس کو مصدریہ بھی مانا گیا ہے اور موصولہ بھی۔عام قاعدہ یہ ہے کہ ذوی عقول کے لیے مَنۡ موصولہ آتا ہے اور غیر ذوی عقول کے لیے مَا آتا ہے۔لیکن عربی میں کبھی کبھی مَا بھی ذوی عقول کے لیے آجاتا ہے۔یعنی کبھی مَا بھی مَنۡ کے معنی میں آجاتا

ہے۔اس لحاظ سے دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ہم مَا مصدر یہ مان کر ترجمہ کریں گے۔(آیت۔6) طَحَا کا مادہ ''طح و'' بھی ہے اور ''طح ی'' بھی۔ناقص وادی میں یہ دوسرے معانی کے ساتھ پھیلنا (لازم) اور پھیلانا (متعدی) دونوں معانی میں آتا ہے۔جبکہ یائی میں یہ صرف پھیلانا (متعدی) کے معنی دیتا ہے۔اس طرح اس آیت میں طَحَا کو وادی بھی مان سکتے تھے اور یائی بھی۔لیکن قرآن مجید کی کتابت پر جب غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ھَا سے پہلے ایک دندانہ بنا ہوا ہے۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ کاتبانِ وحی نے اس کو یائی مان کر لکھا تھا۔کیونکہ اگر وادی مان کر لکھتے تو یہ طَحٰھَا (دندانے کے بغیر) لکھا ہوتا۔طَحٰھَا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ھا کی ضمیر طَحَا (وادی) پر نہیں بلکہ طَحٰی (یائی) پر لگائی ہے۔(آیت۔8) جوابِ قسم نہیں ہے بلکہ یہ سابقہ آیت میں قسم وَنَفْسٍ کا جز ہے۔ان قسموں کا جوابِ قسم آگے آیات۔9۔10۔میں آیا ہے۔دَسّٰھَا۔ یہ اگر مادہ ''دسس'' کے ثلاثی مجرد سے ہوتا تو یہ دَسَّھَا ہوتا۔نہ سین پر کھڑا زبر ہوتا اور نہ اس کے آگے یا کا دندانہ ہوتا۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ بابِ تفعیل سے ماضی کا صیغہ دَسَّسَ ہے۔قاعدے کے مطابق تیسری سین یا میں تبدیل ہوئی تو یہ دَسَّیَ ہوا۔ پھر قاعدے کے مطابق دَسّٰی استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 2/البقرۃ: 259، نوٹ۔ 2) (آیت۔13)۔نَاقَةَ اللّٰهِ میں نَاقَةَ کی نصب بتا رہی ہے کہ اس کا فعل محذوف ہے جو کہ اِحْذَرُوْا (تم لوگ محتاط رہو) ہو سکتا ہے۔

ترجمہ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۙ﴿۱﴾	وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی	اور قسم ہے چاند کی جب وہ پیچھے پیچھے آتا ہے اس (سورج) کے

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۙ﴿۳﴾	وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۙ﴿۴﴾
اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن کر دیتا ہے اس (سورج) کو	اور قسم ہے رات کی جب وہ ڈانپ لیتی ہے اس (سورج) کو

وَالسَّمَآءِ	وَمَا	بَنٰىهَا ۙ﴿۵﴾	وَالْاَرْضِ	وَمَا	طَحٰىهَا ۙ﴿۶﴾
اور قسم ہے آسمان کی	اور اس کی جیسا	اس نے بنایا اس (آسمان) کو	اور قسم ہے زمین کی	اور اس کی جیسا	اس نے پھیلایا اس کو

وَنَفْسٍ	وَّمَا	سَوّٰىهَا ۙ﴿۷﴾	فَاَلْهَمَهَا
اور قسم ہے نفس کی	اور اس کی جیسا	اس نے سنوارا اس کو	پھر اس نے الہام کیا اس میں

فُجُوْرَهَا	وَتَقْوٰىهَا ۙ﴿۸﴾	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ	زَكّٰىهَا ۙ﴿۹﴾
اس کی نافرمانی	اور اس کی پرہیزگاری (کا شعور)	مراد پا چکا ہے وہ جس نے	پاک رکھا اس (نفس) کو

وَقَدْ خَابَ مَنْ	دَسّٰىهَا ؕ﴿۱۰﴾	كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ	بِطَغْوٰىهَآ ۙ﴿۱۱﴾
اور نامراد ہو گیا وہ جو	خاک آلود کرتا رہا اس (نفس کو)	جھٹلایا ثمود نے (رسول کو)	اپنی سرکشی کے باعث

اِذِ انْۢبَعَثَ	اَشْقٰىهَا ۙ﴿۱۲﴾	فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ	نَاقَةَ اللّٰهِ	وَسُقْيٰهَا ؕ﴿۱۳﴾
اب اٹھ کھڑا ہوا	ان کا زیادہ شقی	تو کہا اُن لوگوں سے اللہ کے رسولؐ نے	(محتاط رہو) اللہ کی اونٹنی سے	اور اس کے پینے (کی باری) سے

فَكَذَّبُوْهُ	فَعَقَرُوْهَا ۚ	فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ
پھرانہوں نے جھٹلایا اُن (رسولؑ) کو	توانہوں نے ٹانگیں کاٹیں اس (اونٹنی) کی	پس دھمادھم برسایا ان پر (عذاب)

رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ	فَسَوّٰىهَا ۖ﴿۱۴﴾	وَلَا يَخَافُ	عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾
ان کے رب نے ان کے گناہ کے باعث	تواس نے برابر کردیا اس (قوم) کو	اور وہ نہیں ڈرتا	اس کے نتیجے سے

نوٹ:1

مضمون کے لحاظ سے یہ سورہ دو حصوں میں مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورہ کے آغاز سے آیت۔10۔ پر ختم ہوتا ہے۔اور دوسرا حصہ آیت۔ 11۔ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصے میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ایک یہ جس طرح چاند،سورج، رات، دن اور زمین وآسمان ایک دوسرے سے مختلف اور نتائج میں متضاد ہیں اسی طرح سے نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور نتائج میں متضاد ہیں۔دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو جسم، حواس اور ذہن کی قوتیں دے کر ایک فطری الہام کے ذریعے اس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق، ان کے مابین امتیاز اور ایک کے خیر اور دوسرے کے شر ہونے کا احساس اتار دیا ہے۔تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رجحانات میں سے کس کو ابھارتا اور کس کو دباتا ہے۔دوسرے حصے میں قوم ثمود کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔رسول دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جو الہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے، وہ بجائے خود انسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے۔کیونکہ اس الہامی علم کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیر وشر کے غلط فلسفے اور معیار تجویز کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔8۔کا جملہ ساتویں قسم وَنَفْسٍ کے ساتھ مربوط ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا پھر اس کے دل میں فجور اور تقویٰ، دونوں کا الہام کر دیا۔مراد یہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اور طاعت، دونوں کے مادے اور استعداد رکھ دی ہے۔ پھر انسان کو ایک اختیار اور قدرت دے دی کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے گناہ کی راہ اختیار کر لے یا طاعت کی۔ جب وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ان میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی ارادے اور اختیار پر اس کو ثواب یا عذاب ملتا ہے۔(معارف القرآن)۔

اس جگہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اس کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے۔مثلاً حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضرورت کے مطابق الہامی علم دیا ہے جس کی بنا پر مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور بَیٔ (چھوٹی چڑیا) کو گھونسلا بنانا آجاتا ہے۔انسان کو اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیئے گئے ہیں۔انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے۔اس حیثیت سے جو الہامی علم اس کو دیا گیا ہے اس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے۔اس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اس کو نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔اس حیثیت سے خدا نے انسان کے آغاز سے مسلسل اس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ پے در پے ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کر رہا ہے ان ایجادات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر وکاوش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آگئی اور اس کی بدولت اس نے کوئی چیز ایجاد کر لی۔ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے۔اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر وشر کا امتیاز اور خیر کے خیر ہونے اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔یہ امتیاز اور احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے۔دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر وشر کے تصورات سے خالی نہیں رہا۔اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے اور نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔اس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلۂ تہذیب و

تمدن میں پایا جانا، اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ ایک حکیم اور دانا خالق نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مادی اجزا سے انسان کا جسمانی وجود مرکب ہے اور دنیا کا مادی نظام جن قوانین کے تحت چل رہا ہے، ان کے اندر کہیں بھی اخلاق کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

گزشتہ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں، وہ جس بات پر کھائی گئی ہیں، اسے آیات۔9۔10 میں بیان کیا گیا ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے وہ فلاح پائے گا۔اور وہ شخص نامراد ہوگا جو نیکی کے رجحانات کو دبا دے اور فجور کو تقویٰ پر غالب کردے۔بعض مفسرین نے ان آیات کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ نے دبا دیا، لیکن یہ تفسیر زبان کے لحاظ سے قرآن کے طرز بیان کے خلاف ہے۔اور یہ تفسیر اسی موضوع پر قرآن کے دوسرے بیانات سے ٹکراتی ہے۔مثلاً سورۂ اعلیٰ کی آیت۔14۔میں ہے کہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔سورۂ عبس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔ان دونوں آیتوں میں پاکیزگی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جارہا ہے۔اب ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے بے معنی ہوجاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے۔اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ زَكّٰهَا اور دَسّٰهَا کا فاعل بندہ ہے نہ کہ خدا۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔12۔اور 14۔پر غور کرنے سے ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اونٹنی کے قتل کا ارتکاب قوم کے اندر سے ایک ہی شخص نے کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مجرم پوری قوم کو ٹھہرایا اور اس کی سزا بھی پوری قوم کو دی۔اس سے قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے جرم میں پوری قوم کو سزا دیتا ہے اگر قوم اس جرم پر راضی ہو۔اس کے وبال سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کے لیے جو کر سکتے ہوں وہ کر گزریں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے بیزار اور کنارہ کش رہیں۔اس سے نیچے نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی سبیل ہے۔

بِذَنۡۢبِهِمۡ کے الفاظ سے وضاحت ہوگئی کہ عذاب ان کے اوپر اس جرم کے سبب سے آیا کہ اللہ کے رسول کی تنبیہہ کے باوجود انہوں نے اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی۔ظاہر ہے کہ اس جرم کے بعد اگر ان کو ڈھیل ملتی تو وہ اللہ کے رسول پر بھی ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جرم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو نہیں دی بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ تباہ کر دی گئی۔(یہ سنت الٰہی رسولوں سے متعلق ہے۔جبکہ انبیاء قتل کیے گئے ہیں۔مرتب)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈروں نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کے مشورے شروع کر دیئے تھے۔یہ مشورے چونکہ خفیہ تھے۔اس وجہ سے قرآن نے بھی اشارات کی زبان میں ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ کوئی ارادہ بد اپنے دل میں پرورش کر رہے ہیں تو اس کے دوررس نتائج پر نگاہ ڈال لیں۔(تدبر قرآن)

نوٹ:5

آیت۔15۔کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرتا ہے، تو اپنی اس سنت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اس دنیا کی مصلحت اور

بہبود کے لیے اپنے علم اور قدرت کے تحت ٹھہرا رکھی ہے اس وجہ سے نہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلے میں کوئی غلطی ہوسکتی ہے اور نہ یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کو کوئی چیلنج کرسکتا ہے۔ اس سے ضمنی طور ان لغو بیانات کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو تورات کی کتاب پیدائش میں اس کے راویوں نے ملائے ہیں۔ مثلاً ''اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے تصور اور خیالات سدا (ہمیشہ) برے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔'' (پیدائش۔ باب۔ 6۔ آیت۔ 5۔ 6) (تدبر قرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الیل (92)

آیت نمبر (1 تا 21)

ترکیب

(آیت۔4) شَتّٰی۔ یہ مادہ ''ش ت ت'' سے باب تفعیل کا ماضی کا صیغہ نہیں ہے کیونکہ اس پر اِنَّ کی خبر پر آنے والا لامِ تاکید لگا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت شَتِیۡتٌ کی جمع ہے، جیسے مَرِیۡضٌ کی جمع مَرۡضٰی ہے اس حوالے سے یہاں پر یہ بھی نوٹ کرلیں کہ فُعۡلٰی کا وزن افعل تفضیل کی مؤنث کے لیے ہے۔ جبکہ فَعۡلٰی جمع مکسر کے اوزان میں سے ایک وزن ہے۔ (آیت۔ 11) تَرَدّٰی میں یا اصلی ہے۔ یعنی یہ مادہ ''ردی'' سے باب تفعل کا ماضی تَرَدَّیَ ہے جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر تَرَدّٰی استعمال ہوتا ہے۔ (آیت۔12) اِنَّ کا اسم اَلۡھُدٰی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو وَاجِبٌ ہوسکتی ہے۔ خبر محذوف ہونے کی وجہ سے اِنَّ کی خبر پر آنے والا لامِ تاکید اس کے اسم پر آ گیا ہے، جس نے اَلۡھُدٰی کے ہمزۃ الوصل کو لکھنے میں بھی ساقط کر دیا۔ عَلَیۡنَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت۔13) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے اَلۡاٰخِرَۃَ حالتِ نصب میں آیا ہے۔ اس کی بھی خبر محذوف ہے اس لیے لام تاکید اَلۡاٰخِرَۃَ پر داخل ہوا تو لَلۡاٰخِرَۃَ استعمال ہوا۔ اَلۡاُوۡلٰی بھی اِنَّ کا اسم ہے لیکن فُعۡلٰی کے وزن پر رفع۔ نصب۔ جر ظاہر نہیں ہوتی۔ آیت نمبر 14 میں تَلَظّٰی باب تفعل کا صیغہ واحد مونث غائب ہے۔ جو اصل میں تَتَلَظّٰی تھا۔ ایک تا کو گرا دیا گیا ہے۔ (آیت۔15) یَصۡلٰھَا میں ھَا کی ضمیر نَارًا تَلَظّٰی کے لیے ہے اور یَصۡلٰی کا فاعل اَلۡاَشۡقَی ہے۔ یہ افعل تفضیل کے مذکر کے وزن اَفۡعَلُ پر حالت رفع میں اَشۡقَی تھا جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر اَشۡقٰی آیا ہے۔ آگے م لانے کے لیے کھڑی زبر کو ہٹا کر اس پر پڑی زبر ڈالی ہے۔ (آیت۔18) یَتَزَکّٰی باب تفعل سے مضارع کا صیغہ ہے اور یہاں یہ حال کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ کوئی اسم جب حال کے طور پر آتا ہے تو وہ حالت نصب میں ہوتا ہے اور کوئی فعل جب حال کے طور پر آتا ہے تو وہ مضارع کا کوئی صیغہ ہوتا ہے۔ (آیت۔19) عِنۡدَہٗ کی ضمیر اَلۡاَتۡقٰی کے لیے ہے۔ تُجۡزٰی کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مِنۡ نِعۡمَۃٍ مَحلًا حالت رفع میں ہے۔

ترجمہ

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾	وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾	وَمَا
قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے	اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہوتا ہے	اور قسم ہے اس کی جو

خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾	اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾	فَاَمَّا مَنۡ	اَعۡطٰی وَاتَّقٰی ۙ﴿۵﴾
اس نے پیدا کیے مذکر اور مؤنث	بیشک تم لوگوں کی سعی و جہد متفرق ہے	پس وہ جو ہے جس نے	خوش دلی سے دیا اور پرہیز گار رہا

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (6)	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْيُسْرٰى (7)	وَاَمَّا مَنْۢ
اور اس نے تصدیق کی اس بڑی بھلائی کی	تو ہم پہنچا دیں گے اس کو	اس بڑی آسانی تک	اور وہ جو ہے جس نے

بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (8)	وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (9)	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْعُسْرٰى (10)
کنجوسی کی اور بے پرواہ ہوا	اور اس نے جھٹلایا اس بڑی بھلائی کو	تو ہم پہنچا دیں گے اس کو	اُس بڑی سختی تک

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ	اِذَا تَرَدّٰى (11)	اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (12)
اور کام نہ آئے گا اس کے اس کا مال	جب وہ گڑھے میں گرے گا	بیشک ہم پر یقیناً ہے راہ سمجھا دینا

وَاِنَّ لَنَا	لَلْاٰخِرَةَ	وَالْاُوْلٰى (13)
اور بیشک ہمارے لیے ہی (قبضۂ قدرت میں)	آخرت (بھی) ہے	اور یہ پہلی (دنیا) بھی ہے

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا	تَلَظّٰى (14)	لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (15)
پس میں نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو ایک ایسی آگ سے	جو غصہ سے بھڑک اُٹھتی ہے	نہیں گرے گا اس میں مگر بڑا بدبخت

الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (16)	وَسَيُجَنَّبُهَا	الْاَتْقَى (17)	الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ
وہ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا	اور بچا لیا جائے گا اس (آگ) سے	بڑے پرہیزگار کو	وہ جو دیتا ہے اپنا مال

يَتَزَكّٰى (18)	وَمَا لِاَحَدٍ	عِنْدَهٗ	مِنْ نِّعْمَةٍ
پاکیزگی حاصل کرتے ہوئے	اس حال میں کہ نہیں ہے کسی ایک کا	اس کے پاس (یعنی اس پر)	کوئی بھی ایسی نعمت (احسان) جس کا

تُجْزٰٓى (19)	اِلَّا	ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (20)	وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (21)
بدلہ دیا جاتا ہو	سوائے اس کے کہ	اپنے اعلیٰ رب کی توجہ کی جستجو کرنا	اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہوگا

نوٹ:1

آیات۔5۔6۔ میں انسانی کوششوں کی ایک قسم میں تین کا ذکر کیا گیا ہے غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ اللہ نے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں صرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعانی لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔انسانی کوششوں کی اس قسم کا نتیجہ اگلی آیت میں بیان ہوا ہے اس طرزِ زندگی میں سب سے پہلی آسانی انسان کو یہ حاصل ہوتی ہے کہ یہ راستہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔اس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑ کر نہیں چلنا پڑتا۔اس میں انسان کو ہر طرف اس مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری زندگی میں پیش آتا ہے۔اور معاشرے میں اسے ہر قدم پر صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسر آتی چلی جاتی ہے۔ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خلق خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کر رہا ہو، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہرحال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے۔لوگ اس کی طرف کھنچتے ہیں۔اس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی بھی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات سورۂ نحل کی آیت۔97۔ میں اس طرح فرمائی گئی کہ جو شخص نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (یعنی اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو اسے ہم

پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔اور اسی بات کو سورۂ مریم کی آیت۔96، میں یوں فرمایا گیا کہ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے،تو رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سورۂ بلد میں اسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ان دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے جس پر چڑھنے کے لیے اسے اپنے نفس کی خواہشوں سے،اپنے دنیا پرست اہل وعیال سے،اپنے رشتہ داروں سے،اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے۔کیونکہ ہر ایک اس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔لیکن جب انسان اس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے تو اس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لڑھکنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔(مطلب یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے سے پہلے یہ انسان کو دشوار گزار محسوس ہوتا ہے۔لیکن جب وہ عملاً اس پر چلنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اسے بتدریج وہ آسانیاں میسر آنا شروع ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔مرتب) پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سرور ہی سرور اور راحت ہے۔اس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ ابدی اور لازوال ہیں۔(تفہیم القران)

نوٹ:2

آیات۔8۔9۔میں انسانی کوششوں میں سے دوسری قسم کا بیان ہے جو اپنے ہر جز میں پہلی قسم کے ہر جز سے مختلف ہے۔عام طور پر لوگ اس آدمی کو کنجوس کہتے ہیں جو روپیہ پیسہ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے اپنے اور اپنے بال بچوں پر خرچ نہیں کرتا۔لیکن اس جگہ بخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ نہ کرنا ہے۔اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر،اپنے عیش وآرام اور تفریحات پر تو دل کھول کر خرچ کرتا ہے،مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا۔بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے فائدہ ہی کو اپنی ساری تگ ودو کا مقصود بنالے اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرے کہ کس کام سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کس کام سے ناراض ہوتا ہے۔اس راستہ کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے والا اگرچہ دنیوی لذتوں اور ظاہری کامیابیوں کے لالچ میں اس طرف جاتا ہے لیکن اس میں ہر وقت اپنی فطرت سے،اپنے ضمیر سے،اللہ کے بنائے ہوئے قوانین سے اور معاشرے سے اس کی جنگ جاری رہتی ہے۔اگر وہ کمزور ہو تو اس روش کے عوض اسے طرح طرح کی سزائیں بھگتنی ہوتی ہیں۔اور اگر وہ طاقتور اور بااثر ہو تو چاہے دنیا اس کے زور آگے دب جائے لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی،عزت اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا،اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے،تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی۔برائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیئے جائیں گے اور اسی کے اسباب اور وسائل اسے فراہم کر دیئے جائیں گے۔بدی کرنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔15 میں ہے کہ اس میں یعنی بھڑکتی آگ میں وہی گرے گا جو زیادہ شقی ہے۔یہاں بھڑکتی آگ سے شاید دوزخ کا وہ طبقہ مراد ہوگا جو بڑے بھاری مجرموں اور بدبختوں کے لیے مخصوص ہے۔(ترجمہ شیخ الہند)۔اس لحاظ سے آیت۔17۔کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو جتنا زیادہ پرہیزگار ہوگا اس کو اس بھڑکتی آگ سے اتنا ہی دور رکھا جائے گا۔(مرتب)

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2029

سورۃ الضحیٰ (93)

آیت نمبر (1 تا 11)

س	ج	و

(ن) سَجۡوًا رات کا پرسکون ہونا۔ سنسان ہونا۔ خاموش ہونا۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں رات کا چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔(اس کا مادہ ناقص واوی ہے اور اس کا ماضی کا صیغہ سجا یا سجی لکھا جاتا ہے یہاں اس کو سجیٰ (ناقص یائی کی طرح لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے)۔

ترکیب

(آیت۔2) سَجٰی ماضی ہے لیکن اِذَا کی وجہ سے ترجمہ حال میں ہوگا۔ (آیات۔6۔7۔اور 8۔ میں فَاٰوٰی، فَهَدٰی اور فَاَغۡنٰی، اِن تینوں کے آگے ضمیر مفعولی كَ محذوف ہے۔ (آیت۔7) اس میں ضَآلًّا اسم الفاعل ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اس کی جمع ضَالِّيۡنَ آئی ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ 'گمراہ' کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں اس کا ترجمہ راستہ تلاش کرنے والا کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے فرمایا کہ انہوں نے متعدد ڈکشنریاں اور کُتب دیکھیں تو اس لفظ کے کوئی بارہ مختلف مفاہیم میں استعمال سامنے آئے۔ اور قرآن مجید میں بھی یہ متعدد مفاہیم میں آیا ہے۔ پھر انہوں نے تلاش کیا کہ اس لفظ کا وہ بنیادی معنی کیا ہے جس سے یہ تمام مفاہیم نکلتے ہیں۔ تو انہوں نے امام راغب اصفہانیؒ کے بیان کردہ معنی کو اس لحاظ سے سب سے زیادہ تسلی بخش پایا۔ امام صاحب نے اس کے معنی بتائے ہیں کہ مطلوبہ راستہ سے ہٹ جانا، خواہ قصداً ہو یا سہواً، معمولی ہو یا زیادہ۔ قرآن میں اس کے مختلف استعمال کا ایک خاکہ ذہن نشین کرنے کے لیے طلبا زیر حوالہ آیات کو قرآن میں دیکھ لیں۔ واضح رہے کہ یہ مکمل فہرست نہیں ہے البقرہ۔282۔ (اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا)۔ الانعام۔24۔ بنی اسرائیل۔67۔ الکہف۔104، طٰہٰ۔52۔ محمد۔1۔ (آیات۔9 تا 11) اَلۡيَتِيۡمَ اور اَلسَّآئِلَ کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ لَا تَقۡهَرۡ اور لَا تَنۡهَرۡ کے مفعول مقدم ہیں اور حَدِّثۡ کے مفعول پر بِ کا صلہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ یہ پورا فقرہ حَدِّثۡ کا مفعول مقدم ہے۔ اَلۡيَتِيۡمَ اور السَّآئِلَ پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾	وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾	مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ
قسم ہے چاشت کے وقت کی	اور قسم ہے رات کی جب سناٹا ہو جاتا ہے	نہ الوداع کہا آپؐ کو آپؐ کے رب نے

وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾	وَلَلۡاٰخِرَةُ	خَيۡرٌ لَّكَ	مِنَ الۡاُوۡلٰى ؕ﴿۴﴾
اور نہ وہ بیزار ہوا (آپؐ سے)	اور یقیناً بعد میں آنے والی (حالت)	بہتر ہے آپؐ کے لیے	پہلی سے

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ	فَتَرۡضٰى ؕ﴿۵﴾	اَلَمۡ يَجِدۡكَ	يَتِيۡمًا فَاٰوٰى ۪﴿۶﴾
اور یقیناً عنقریب عطا کرے گا آپؐ کو آپؐ کا رب	نتیجتاً آپؐ راضی ہو جائیں گے	کیا اس نے نہیں پایا آپؐ کو	یتیم تو اس نے رہنے کی جگہ دی (آپؐ کو)

وَوَجَدَكَ	ضَآلًّا	فَهَدٰى ۪﴿۷﴾	وَوَجَدَكَ عَآئِلًا
اور اس نے پایا آپؐ کو	راہ تلاش کرنے والا	تو اس نے رہنمائی کی (آپؐ کی)	اور اس نے پایا آپؐ کو تنگ دست

فَاَغۡنٰی ﴿۸﴾	فَاَمَّا	الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ ﴿۹﴾	2029
تو اس نے غنی کیا آپؐ کو)	پس وہ جو ہے، تو	کسی بھی یتیم کو پس آپؐ ذلیل مت کریں	اور وہ جو ہے، تو

السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ﴿۱۰﴾	وَ اَمَّا	بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾
کسی بھی مانگنے والے کو پس آپؐ مت جھڑکیں	اور وہ جو ہے تو	اپنے رب کی نعمت کا آپؐ چرچا کریں

نوٹ:1

اس سورہ میں پہلے آفاق کے شواہد سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح اس دنیا کی مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے دن کی حرارت و روشنی کی ضرورت ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی کی بھی، اسی طرح انسانی فطرت کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو تنگی اور آسانی، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت، دونوں طرح کے حالات سے گزارا جائے۔ جو لوگ زندگی کی تربیت میں ان امتحانوں کا مقام سمجھتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کی اعلیٰ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور جو لوگ ان امتحانوں کی حکمت سے ناوقف ہوتے ہیں یا اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ان سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے قدرت نے ان کو مقدر کیا ہے، وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند سے محروم کر لیتے ہیں۔ جو اس امتحان سے گزرے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد نبی ﷺ کو خطاب کر کے تسلی دی ہے کہ جس امتحان سے آپ گزر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے کسی عتاب کے سبب پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ اسی امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

روایات میں ہے کہ جبریلؑ دیر تک رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ آئے، یعنی وحی قرآنی بند رہی تو مشرکین کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کو اس کے رب نے رخصت کر دیا۔ اس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ لیکن میرا گمان یہ ہے کہ مخالفین نے اس وقت اس طرح کی باتیں کی ہوں جب سورۂ اِقرء کی ابتدائی آیات نازل ہونے کے بعد ایک طویل مدت تک وحی رکی رہی اور حضور ﷺ خود اس فترت (بندش) کے زمانے میں مضطرب رہے۔ یہاں تک کہ فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ کا خطاب سنایا۔ چنانچہ ابن کثیرؒ نے ابن اسحاق وغیرہ سے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ اسی احتمال کی تائید کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسی دوران وہ قصہ بھی پیش آیا ہو جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ بیماری کی وجہ سے دو تین رات نہ اٹھ سکے تو ایک عورت کہنے لگی ''اے محمد معلوم ہوتا ہے تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا ہے۔'' (العیاذ باللہ)۔ غرض ان سب خرافات کا جواب اس سورہ میں دیا گیا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

واضح رہے کہ مکی دور میں جب قریش کی مخالفت زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے آپ ﷺ کو خاص پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کی اس بیزاری میں آپ ﷺ کی کسی کوتاہی یا بے تدبیری کا کوئی دخل ہو جو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب بنی ہے۔ جس کے باعث یہ حالات پیش آ رہے ہیں۔ اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ ﷺ کو وحی کا انتظار ہوتا کیونکہ یہی وہ واحد چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اسی سے آپ ﷺ کو یہ اندازہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ ﷺ فریضۂ دعوت رب کی منشا کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ حضور ﷺ کی ان پریشانیوں کا ذکر مکی سورتوں میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ اس آیت (نمبر 3) میں آپ ﷺ کو جو تسلی دی گئی ہے وہ ایسے ہی حالات میں دی گئی ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔4۔ میں اٰخرۃ اور اُولیٰ کے الفاظ دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم میں ہیں۔ یعنی دعوت کے آخری دور اور ابتدائی دور کے یا دعوت کے موجودہ دور اور اس کے مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ اسی تسلی کی مزید وضاحت ہے کہ اس وقت

جو حالات ہیں وہ بدل جائیں گے اور مستقبل موجودہ حال سے بہت بہتر ہوگا۔ قدیم صحیفوں میں آنحضرت ﷺ سے متعلق جو پیشن گوئیاں وارد ہوئی ہیں ان میں آپ ﷺ کی دعوت کے آغاز کو رائی کے دانے کی تمثیل سے سمجھایا ہے جو ہوتا تو نہایت چھوٹا ہے لیکن جب اُگتا ہے تو اس کا پودا سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پرندے اس میں بسیرا لیتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں دی تھی جبکہ مٹھی بھر آدمی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ ﷺ کی مخالف تھی اور بظاہر کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ ﷺ پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ ﷺ کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ ﷺ کی قوت، عزت اور قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ ﷺ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ اور اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپؐ کو ملے گا وہ اُس مرتبہ سے بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو دنیا میں آپ ﷺ کو حاصل ہوگا۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 4 آیت۔ 5۔ کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو اتنا دے گا کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں گے۔ اس میں حق تعالیٰ نے یہ متعین کر کے نہیں بتایا کہ کیا دیں گے۔ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپ ﷺ کی ہر مرغوب چیز آپ ﷺ کو اتنی دیں گے کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں۔ آپ ﷺ کی مرغوب چیزوں میں اُمت کی ہر ضرورت، زمین میں اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دین حق پھیلانا سب داخل ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہاں تک کہ حق تعالیٰ فرمائیں گے اے محمد (ﷺ) اب آپ راضی ہیں، تو میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہے۔ ﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۳۶﴾ (سورہ ابراہیم: 36) پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ﴾ (المائدہ۔ 118)

پھر آپ ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ آپ ﷺ روتے رہے اور بار بار فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر جبریلؑ تشریف لائے اور پوچھا کہ آپؐ کیوں روتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کی مغفرت چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ سے فرمایا کہ جاؤ اور کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 5 آنحضرت ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی آپ ﷺ کے والد وفات پا چکے تھے۔ چھ سال کی عمر تھی کہ والدہ نے رحلت کی پھر آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں رہے۔ آخر میں ظاہری تربیت و پرورش کی سعادت آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے حصے میں آئی۔ انہوں نے زندگی بھر آپ ﷺ کی نصرت و حمایت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔ پھر یہ امانت الٰہی اللہ کے حکم سے انصارِ مدینہ کے گھر پہنچ گئی۔ اوس اور خزرج کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ فَاٰوٰی کے تحت میں داخل ہیں۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ: 6 یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے ملیں ان پر آپ ﷺ کی سلیم

فطرت مطمئن نہ ہوسکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ ﷺ کے لیے سرمایہ تسکین بنتی۔ آسمانی مذاہب سے پیروکار جو آپ ﷺ کے اردگرد تھے ان کے عقائد واعمال اس قدمسخ ہو چکے تھے کہ کوئی حقیقت کو تلاش کرنے والا ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس صورتِ حال نے آپ ﷺ کو ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ آپ ﷺ کی اسی کشمکش کو آیت۔ 7۔ میں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں۔ لیکن فطرت عقائد واعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کرتی ہے لیکن عقائد واعمال کے تمام لوازمات کی وہ تشریح نہیں کرسکتی۔ اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات کیا ہیں اور ان صفات کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے ہیں اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں۔ زندگی کی ایک ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری خالق کی پسند کے مطابق ہوجائے یہی سوالات ہیں جو نبی ﷺ کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ اشارہ کررہے ہیں۔ بعثت سے پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں آپ ﷺ انہی گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں دین حنیفی کے پیروکاروں کا حال کتابوں میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایسی شدید الجھن میں مبتلا تھے کہ وہ بیت اللہ سے ٹیک لگا کر حرم میں بیٹھ جاتے تھے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ اے رب ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں ورنہ اسی طرح کرتے۔ یہی حال اس وقت تک نبی ﷺ کا بھی رہا ہوگا جب تک آپ ﷺ کتاب سے روشناس نہیں ہوئے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت۔ 52۔ میں اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر میں سے ہے۔ نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس وحی کو روشنی بنایا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 7

آیت۔ 10۔ کے دو معنی ہیں۔ اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مدد کرسکتے ہو تو کردو، ورنہ نرمی کے ساتھ معذرت کرلو، مگر بہرحال اسے جھڑکو نہیں۔ اور اگر سائل کو پوچھنے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پوچھنے والا خواہ کیسا ہی جاہل اور اُجڈ ہو اور خواہ کتنے ہی نامعول طریقے سے سوال کرے، بہرحال اسے شفقت کے ساتھ جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور مت کرو۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 8

نعمت کا لفظ عام ہے۔ اس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول تک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی تھیں اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں عطا کیں۔ پھر حکم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے اس کا ذکر اور اس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ادا کرے اور اس بات کا اقرار واعتراف کرے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں یہ سب اللہ کا فضل واحسان ہیں اور کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمت نبوت کا اظہار یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمت قرآن کا اظہار یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمت ہدایت کا اظہار یہ ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور ترشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ الغرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے فقرے میں دی۔ (تفہیم القرآن)۔

ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ مالی نعمت کا شکریہ ہے کہ اس مال میں سے کچھ اللہ کے لیے اخلاص نیت کے ساتھ خرچ کرے۔ نعمت بدن کا شکریہ ہے کہ جسمانی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا کرنے میں صرف کرے۔ علم و معرفت کا شکریہ ہے کہ دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 9

سورۂ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے۔ اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ بتلائے ہیں۔ ابن کثیر نے ہر سورت کے ختم پر بغوی نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے۔ دونوں میں جو صورت بھی اختیار کرے سنت ادا ہو جائے گی۔

سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ ﷺ پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ ﷺ کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے اور چند سورتوں میں قیامت اور اس کے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابل شک و شبہہ ہونے سے کیا گیا اور ختم قرآن اس ذات کی عظمت و شان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔ (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الم نشرح (94)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترجمہ

اَلَمْ نَشْرَحْ	لَكَ صَدْرَكَ ۙ﴿۱﴾	وَوَضَعْنَا	عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾
کیا ہم نے کھول نہیں دیا	آپؐ کے لیے آپؐ کے سینے کو	اور ہم نے اتارا	آپؐ سے آپؐ کے بوجھ کو

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ	ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾	وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ﴿۴﴾
وہ (بوجھ) جس نے ٹوٹنے کے قریب کیا	آپؐ کی پیٹھ کو	اور ہم نے بلند کیا آپؐ کے لیے آپؐ کے ذکر کو

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ﴿۵﴾	اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ﴿۶﴾	فَاِذَا فَرَغْتَ
پس یقیناً سختی کے ساتھ ایک نرمی ہے	بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے	پھر جب آپؐ فارغ ہوں

فَانْصَبْ ۙ﴿۷﴾	وَاِلٰى رَبِّكَ	فَارْغَبْ ﴿۸﴾
تو آپؐ کوشش کریں	اور اپنے رب کی طرف ہی	پھر آپؐ التجا کریں

نوٹ: 1

شرح صدر (سینہ کھولنے) کا لفظ قرآن میں جن مواقع پر آیا ہے ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردد سے پاک ہو کر اس بات پر مطمئن ہو جانا کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے۔ دوسرا یہ کہ نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔ مثلاً سورۂ انعام۔ آیت۔125۔ میں ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہاں یہ لفظ پہلے معنی میں ہے۔ جبکہ سورۂ طٰہٰ۔ آیات۔25۔26۔ میں ہے کہ نبوت ملنے کے موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ اے میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔

یہاں یہ دوسرے معنی میں ہے غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنی مراد ہیں۔(تفہیم القرآن)۔ 2029

نوٹ:2

وِزْرَ سے مراد غم کا بوجھ ہے جو بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے دل پر اس سبب سے تھا کہ آپ ﷺ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پھر جب اللہ نے آپ ﷺ پر ہدایت کی راہ کھول دی تو اس غم پر مزید اضافہ اس سبب سے ہوا کہ آپ ﷺ کی پوری قوم دشمن بن کر کھڑی ہوگئی۔ اور توقع کے خلاف جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ جتنی دعوت کی راہ میں آپ ﷺ کی سرگرمی بڑھتی جارہی تھی اتنی ہی لوگوں کی مخالفت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، تو قدرتی طور پر آپ ﷺ کو یہ گمان گزرا کہ شاید آپ ﷺ کی جدو جہد میں کہیں کوئی کمی ہے۔ علاوہ ازیں اس طرح کے حالات میں اگر وحی کے آنے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو یہ وقفہ بھی آپ ﷺ کی پریشانی میں اضافہ کر دیتا۔ حضور ﷺ کی ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح پچھلی سورہ میں تسلی دی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی دی گئی ہے۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

رسول اللہ ﷺ کا ذکر بلند کرنے کی بات اس زمانے میں فرمائی گئی تھی جب کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہر مکہ تک محدود ہیں اس کا ذکر دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ہی حالات میں یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اسے پورا کیا۔ سب سے پہلے اس نے آپ ﷺ کے رفع ذکر کا کام خود آپ ﷺ کے دشمنوں سے لیا۔ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ ان کے شہر میں آتے تھے، اس زمانے میں کفار مکہ کے وفود حاجیوں کے ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک شخص ہے جو لوگوں پر جادو کرتا ہے تو باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے۔ اس لیے اس سے بچ کے رہنا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ ﷺ کا نام پہنچ گیا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں منافقین، یہود اور تمام عرب کے مشرکین آپ ﷺ کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے۔ دشمنوں نے جنگ سے حضور ﷺ کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی مگر آپ ﷺ کی قیادت میں اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے نظم وضبط، شجاعت اور اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری ثابت کر کے سارے عرب سے اپنا لوہا منوالیا۔ اور دس سال کے اندر اندر حضور ﷺ کا رفع ذکر اس طرح ہوا کہ عرب کا گوشہ گوشہ کلمۂ شہادت کی صدا سے گونج اٹھا۔

پھر تیسرے مرحلے کا آغاز خلافتِ راشدہ کے دور سے ہوا جب آپ ﷺ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہوا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جارہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں آپ ﷺ کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں آپ ﷺ پر درود نہ بھیجا جارہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ ﷺ کا ذکرِ خیر نہ ہو۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن، اور دن کے 24 گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ آپ ﷺ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ نبوت کے ابتدائی دور میں جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اس وقت کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ رفع ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک اور کھلا ہوا ثبوت ہے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:4

آیات۔5۔6۔ سے پہلے جو باتیں کہی گئیں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہم نے آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا سینہ کھولا۔ آپ ﷺ سے آپ ﷺ کا بوجھ ہٹایا۔ آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا ذکر بلند کیا۔ لیکن ان آیات میں یہ نہیں کہا کہ آپ ﷺ کی مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بلکہ بات کو عمومی انداز میں کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل آفاقی صداقت (Classical Truth) کا بیان ہے یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی رائج تھا۔ البتہ حیاتِ طیبہ کے دوران وہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ قاعدہ ختم نہیں ہوگیا۔ بلکہ آج بھی ہلکے پیمانے پر جاری ہے۔ اور مومن۔ مسلم۔ کافر۔ دہریہ سب کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ (مرتب)۔ اب اگر دنیا میں کسی شخص کو عُسر کے بعد یُسر نصیب نہ تو وہ اس آیت کے منافی نہیں ہے۔ البتہ عادۃُ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور آسانی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کے حق میں آسانی کردے گا۔ بعض روایات حدیث میں بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔ یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ عُسر اور یُسر دنیا میں لازم وملزوم ہیں۔ ایک گھاٹی کسی نے پار کرلی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔ چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس جہاں میں ہر مسافر کو نشیب وفراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی مسافر منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستے پر چلنے والوں سے بھی ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ راستے کی تمام مشکلات خود بخود دور ہوجائیں، بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں سے ہمت نہیں ہاریں گے تو وہ ان کے لیے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔ جس سے تازہ دم ہو کر وہ آگے کے سفر کے لیے مزید عزم وحوصلہ کرلیں گے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری مشکل سے لڑتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزل مطلوب پر پہنچ جائیں گے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:5

آیات۔7۔8۔ کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو دوسری محنت کے لیے تیار ہوجایئے۔ وہ یہ کہ نماز، ذکر اللہ اور دعا واستغفار میں لگ جائیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتبلیغ، خلق خدا کو راستہ دکھانا اور ان کی اصلاح کی فکر، یہ آپ ﷺ کی سب سے بڑی عبادت تھی۔ مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق تھی۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ اسی عبادت بالواسطہ پر آپ ﷺ قناعت نہ کریں، بلکہ جب اس سے فرصت ملے خلوت میں بلاواسطہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اسی سے کام میں کامیابی کی دعا کریں۔ اصل مقصود جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ عبادت بلاواسطہ ہی ہے۔ شاید اسی لیے عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لیے ہے، اس سے فراغت ہوسکتی ہے اور توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مومن کو کبھی نہیں ہوسکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور کچھ وقت توجہ الی اللہ کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر تبلیغ مؤثر نہیں ہوتی اور اس میں نور وبرکت نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن)

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ التین (95)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترجمہ

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾	وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾	وَہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾
قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی	اور قسم ہے سینین کی (کوہِ) طور کی	اور قسم ہے اس امن والے شہر کی

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ	فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾	ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ
بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو	بہترین تعدیل وتناسب میں	پھر ہم نے لوٹایا اس کو

اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
پست ہونے والوں کا سب سے پست	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے

فَلَہُمۡ اَجۡرٌ	غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۶﴾	فَمَا یُکَذِّبُکَ	بَعۡدُ
تو ان کے لیے ایک ایسا اجر ہے جو	غیر منقطع ہے	تو کیا چیز (دلیل) جھٹلا سکتی ہے آپ کو	اس کے بعد

بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾	اَلَیۡسَ اللّٰہُ	بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾
بدلے کے بارے میں	کیا اللہ نہیں ہے	تمام حاکموں کا سب سے بڑا حاکم

نوٹ: 1

پہلی آیت کی تفسیر میں ایک رائے یہ ہے کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک عام عربی دان ان الفاظ کو سُن کر یہی معنی لے گا۔ لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنی لینے میں رکاوٹ ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طور سینا اور شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے ان چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس طور سینا اور شہر مکہ تو دلالت کرتے ہیں لیکن یہ دو پھل اس پر دلالت نہیں کرتے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تین سے مراد دمشق کا شہر ہے اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہ الفاظ سُن کر یہ معنی ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آسکتے کیونکہ اہل عرب میں یہ بات معروف نہیں تھی کہ تین اور زیتون ان مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریق اہلِ عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو اس علاقے کو بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب ان کی پیداوار کا علاقہ ہوسکتا ہے۔ اور وہ ملک شام اور ملک فلسطین کا علاقہ ہے کیونکہ اس زمانے میں یہی علاقہ ان کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ (تفہیم القرآن)۔

اس طرح ان قسموں میں وہ تمام مقاماتِ مقدسہ شامل ہوگئے جہاں خاص خاص انبیاءؑ پیدا اور مبعوث ہوئے ملک شام عام انبیاءؑ کا وطن ہے۔ کوہ طور حضرت موسیٰؑ کے حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی جگہ ہے۔ جبکہ سینین یا سینا اس مقام کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے۔ اور مکہ مکرمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسکن ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 2

چار چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی جبلت وفطرت کو بھی دوسری مخلوقات کے

اعتبار سے احسن بنایا گیا ہے۔ اور اس کی جسمانی ہیئت اور شکل وصورت کو بھی دوسرے جانداروں سے بہتر اور حسین بنایا گیا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی انسان سے احسن نہیں کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے حیات کے ساتھ عالم۔ قادر۔ متکلم۔ سمیع۔ بصیر۔ مدبر اور حکیم بنایا ہے اور یہ سب صفات دراصل خود اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ مراد اس سے یہی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا کوئی درجہ اس کو بھی دیا گیا ہے۔ ورنہ حق تعالیٰ ہر شکل وصورت سے بَری ہے۔ (معارف القرآن)

تقویم کے بنیادی معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔ سیدھی کی ہوئی چیز میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کی لمبائی اور چوڑائی میں ایک اعتدال اور تناسب ہو۔ خطاطی کے ماہر فن لوگ اگر الف لکھیں گے تو اس کی لمبائی اور موٹائی کے تناسب کا لحاظ رکھیں گے، اسی طرح الفاظ کے تمام حروف کے قدوکاٹھ میں اعتدال اور تناسب کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جو خطاط جتنا مناسب اعتدال وتناسب قائم کرلیتا ہے اس کی خطاطی دیکھنے میں اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم غور کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے انسان کی جسمانی ساخت میں اس کی صلاحیتوں میں اور اس کی استعداد میں جبر وقدر کا ایک بڑا عجیب توازن کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ہماری آنکھ دیکھ سکتی ہے، کان سن سکتے ہیں لیکن ان کی یہ استعداد لامحدود نہیں ہے۔ ایک خاص فاصلہ سے آگے کی آواز ہمارے کان نہیں سن سکتے۔ جبکہ اس فاصلے پر موجود چیزوں کو آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن ایک حد سے آگے آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ ہم کو نفس امارہ دیا گیا ہے تو ساتھ ہی نفس لوامہ بھی دیا گیا ہے۔ اس انداز میں انسان کی فطرت وجبلت پر غور کریں تو ہر جگہ ہمیں توازن، اعتدال اور تناسب کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ دوسری مخلوقات کو یہ حسن اتنا نہیں دیا گیا جتنا انسان کو دیا گیا ہے۔ (مرتب)۔

نوٹ: 3

اس کے آگے۔ ۵۔ میں فرمایا کہ پھر ہم نے اس کو لوٹا دیا پست ترین لوگوں میں۔ یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ پست ترین مخلوق میں یعنی درندوں سے بھی بدتر۔ (مرتب)۔ مفسرین نے عام طور پر اس آیت کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اسے ارذل العمر یعنی بڑھاپے کی ایسی حالت کی طرف پھیر دیا جس میں وہ کچھ سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اسے جہنم کے سب سے نیچے درجے کی طرف پھیر دیا۔ لیکن اس سورہ کا مقصود جزا وسزا کے برحق ہونے پر استدلال کرنا ہے۔ اس لیے یہ دونوں معنی اس مقصود کلام کے لیے دلیل نہیں بنتے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اسے گراوٹ کی اس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اس آیت میں ثُمَّ رَدَدْنٰهُ کے الفاظ آئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ لوٹانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کر رہا ہے لیکن ذمہ دار انسان ہے۔ یہ وہی اندازِ کلام ہے جو قرآن میں جابجا استعمال ہوا ہے اور سب سے پہلے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ والی آیت میں آیا تھا۔ وہیں پر اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/ البقرۃ:7، نوٹ۔4) (مرتب)۔

نوٹ: 4

آیت۔ 7۔8 کا مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے ایک گروہ اعمالِ بد اختیار کرنے کے نتیجے میں اخلاقی پستیوں میں گرتے گرتے سب نیچوں سے بھی نیچے چلا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اعمال صالح اختیار کرنے کے نتیجے میں اسی حالت پر قائم رہتا ہے جو بہترین ساخت پر انسان کو پیدا کرنے سے مطلوب تھی۔ اس کے بعد بدلے کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ کیا عقل یہ کہتی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو۔ جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے تم یہ چاہتے ہو کہ وہ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کو انعام دیں، تو خدا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ تو کیا اس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ انصاف نہیں کرے گا؟ کیا وہ بُرے اور بھلے کو ایک جیسا کر دے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العلق (96)

آیت نمبر (1 تا 5)

اِقۡرَاۡ	بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ	خَلَقَ ۚ﴿۱﴾	خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ
آپؐ پڑھیئے	اپنے اس رب کے نام کے ساتھ جس نے	پیدا کیا (ہر چیز کو)	اس نے پیدا کیا انسان کو

مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾	اِقۡرَاۡ	وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾	الَّذِیۡ عَلَّمَ	بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾
ایک چمٹے ہوئے خون سے	آپؐ پڑھیئے	اور آپؐ کا رب ہی سب سے زیادہ کریم ہے	وہ، جس نے علم دیا	قلم کے ذریعہ سے

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ	مَا	لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾
اس نے علم دیا انسان کو	اس کا جس کو	اس نے جانا ہی نہیں

نوٹ: 1

علماء کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ وحی کی ابتدا سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوئی ہے۔ بعض حضرات نے سورۂ مدثر کو اور بعض نے سورۂ فاتحہ کو پہلی سورت قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ علق کی پانچ آیات نازل ہونے کے بعد نزولِ قرآن کچھ عرصہ تک موقوف رہا۔ اس کے بعد پھر اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام سامنے آئے اور سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو سورۂ علق کے نزول کے وقت پیش آئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کو بعض حضرات نے پہلی سورت کہا ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کو پہلی سورت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مکمل سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات ہی کا نزول ہوا تھا۔

ایک طویل حدیث میں وحی کی ابتدا کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ (اس حدیث کی تفصیل تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم صرف اس کے اہم نکات درج کر رہے ہیں۔ مرتب) سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر وحی کا سلسلہ سچے خوابوں سے شروع ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ میں خلوت میں عبادت کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ یہ عبادت لوگوں سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ خاص اور تفکر کی تھی۔

غارِ حرا میں خلوت گزینی کی مدت ایک ماہ ہے یعنی آپ ﷺ نے پورے ماہ رمضان اس میں قیام فرمایا۔ وہاں حضرت جبریل علیہ السلام 2029 تشریف لائے اور فرمایا اِقْرَاْ۔ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ تو جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو آغوش میں لے کر دبایا۔ اس طرح تین مرتبہ ہوا۔ پھر انہوں نے پانچ آیات پڑھیں۔ یہ آیتیں لے کر آپ ﷺ گھر واپس آئے۔ آپ ﷺ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ جب آپ ﷺ کو آفاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے بی بی خدیجہؓ کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ انہیں اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ انہوں نے سنتے ہی کہا یہ وحی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتارا تھا۔ کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو وطن سے نکالے گی، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی یہ دین حق لے کر آیا جو آپ ﷺ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ستایا ہے۔ اس کے چند ہی روز بعد ورقہ بن نوفل کا انتقال ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد وحیٔ قرآن کا سلسلہ رُک گیا۔ روایات میں وحی میں وقفہ کی مدت ڈھائی سے تین سال تک بیان کی گئی ہے۔ (معارف القران۔ ج۸، ص ۷۸۴ سے ماخوذ)۔

یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ ﷺ اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ ﷺ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طلب یا متوقع ہونا تو درکنار آپ ﷺ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ پیش آنے والا ہے۔ فرشتے کا اس طرح سامنے آنا ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ ﷺ کے اوپر وہی وہا جو ایک انسان پر فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ ﷺ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل مکہ کے باشندے تھے، بچپن سے حضور ﷺ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر وہ آپ ﷺ کے حالات سے اور زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب یہ واقعہ سنا تو اِسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک آپ ﷺ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ ﷺ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابل تعجب بات نہ تھی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آپ۔ ۵۔ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا ہے وہ اللہ کے دینے سے حاصل ہوا ہے۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اس پر کھلتے چلے گئے۔ جن جن چیزوں کو انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ ہی نے جب چاہا ان کا علم اسے دیا (تفہیم القرآن)۔ یہ وہ مادی علوم ہیں، جن کا دروازہ کھولنے کا جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کر لیتا ہے تو انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے اور اپنی عقل کی مدد سے ان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس کائنات کے وہ حقائق جو انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی پہنچ سے باہر ہیں، ان کی تعلیم کے لیے رسل وکتب کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ پر اس علم وحی کے فائنل ایڈیشن کا نزول ہوا۔ جبکہ مادی علوم کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (6 تا 19)

س ف ع

(ف) سَفۡعًا — کسی کو پکڑ کر گھسیٹنا۔ کھینچنا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 15۔

ز ب ن

(ض) زَبۡنًا — ٹکر لگانا۔ دھکے دینا۔

زِبۡنِیَۃٌ — ج زَبَانِیَۃٌ۔ سخت انسان یا جن۔ سپاہی۔ زیر مطالعہ آیت۔ 18۔

ترکیب

(آیت۔ 8) اَلرُّجۡعٰی فُعۡلٰی کا وزن ہے لیکن یہ افعل تفضیل میں واحد مونث نہیں ہے بلکہ یہ رَجَعَ۔ یَرۡجِعُ کا ایک مصدر ہے۔ فُعۡلٰی کے وزن پر کچھ مصدر بھی آتے ہیں۔ (آیات۔ 11۔ 13) ان دونوں آیات میں اِنۡ شرطیہ ہے۔ دونوں کا جواب شرط محذوف ہے جسے ترجمہ میں ظاہر کیا جائے گا۔ (آیت۔ 15) یَنۡتَہِ دراصل مضارع یَنۡتَھِیۡ ہے۔ اس کو لَمۡ نے مجزوم کیا تو یا گر گئی۔ لَنَسۡفَعًا دراصل مضارع نَسۡفَعُ ہے۔ اس پر لام تاکید اور نون خفیفہ داخل ہوا تو یہ لَنَسۡفَعَنۡ ہو گیا اور عربی میں یہ اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ یہ قرآن کا مخصوص املا ہے کہ نون خفیفہ کی جگہ تنوین لگا کر الف کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسا قرآن میں صرف دو مرتبہ ہوا ہے۔ ایک اس جگہ اور دوسری سورۂ یوسف کی آیت۔ 32۔ میں لَیَکُوۡنَنۡ کو لَیَکُوۡنًا لکھا گیا ہے۔ (آیت۔ 16) نَاصِیَۃٍ سابقہ آیت میں بِالنَّاصِیَۃِ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے اور یہ نکرہ موصوفہ ہے۔ حالانکہ بِالنَّاصِیَۃِ معرفہ ہے اور اس کا بدل نَاصِیَۃٍ نکرہ ہے۔ لیکن نکرہ موصوف ہو تو معرفہ سے بدل پڑ سکتا ہے۔ (تدبر قرآن) کَاذِبَۃٍ اور خَاطِئَۃٍ اس کی صفت ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں۔

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ	لَیَطۡغٰۤی ﴿۶﴾	اَنۡ رَّاٰہُ	اسۡتَغۡنٰی ﴿۷﴾	اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ
ہرگز نہیں! بیشک انسان	ضرور سرکشی کرتا ہے	(جب) کہ وہ دیکھے خود کو	بے نیاز	بے شک آپؐ کے رب کی طرف ہی

الرُّجۡعٰی ﴿۸﴾	اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡھٰی ﴿۹﴾	عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ﴿۱۰﴾	اَرَءَیۡتَ
لوٹنا ہے (سب کو)	کیا آپؐ نے دیکھا اس کو جو روکتا ہے	ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے	کیا آپؐ نے غور کیا

اِنۡ کَانَ	عَلَی الۡھُدٰۤی ﴿۱۱﴾	اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی ﴿۱۲﴾	اَرَءَیۡتَ
اگر وہ ہوتا	ہدایت پر	یا وہ ترغیب دیتا خدا خوفی کی (تو کیا انسان ہوتا)	کیا آپؐ نے غور کیا

اِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۳﴾	اَلَمۡ یَعۡلَمۡ	بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی ﴿۱۴﴾
اگر اس نے جھٹلایا اور اعراض کیا (تو اپنا ہی نقصان کیا)	کیا اس نے جانا ہی نہیں	کہ اللہ دیکھتا ہے (سب کچھ)

کَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ ۬	لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ﴿۱۵﴾	نَاصِیَۃٍ
ہرگز نہیں! بیشک اگر وہ باز نہ آیا	تو ہم ضرور پکڑ کر گھسیٹیں گے (اس کو) پیشانی کے بال سے	ایک ایسی پیشانی سے جو

کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ ﴿۱۶﴾	فَلۡیَدۡعُ نَادِیَہٗ ﴿۱۷﴾	سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ ﴿۱۸﴾
جھوٹی خطا کار ہے	پس اسے چاہیے کہ وہ بلا لے اپنے اہل مجلس کو	ہم بلائیں گے سپاہیوں (فرشتوں) کو

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ	وَاسْجُدْ	وَاقْتَرِبْ ۩
ہرگز نہیں! آپ مت مانیں اس کی	اور آپ سجدہ کریں	اور آپ قربت اختیار کریں (سجدہ۔ ۱۴)

نوٹ: 1

ان آیات میں آخر سورہ تک ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھنا شروع کی تو ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھنے سے روکا اور دھمکی دی کہ آئندہ نماز پڑھیں گے تو وہ معاذ اللہ آپ ﷺ کی گردن کو پاؤں سے کچل دے گا۔ (معارف القرآن)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا کہ میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا۔ اور اس نے آپ ﷺ کو دھمکیاں دیں۔ جواب میں آپ ﷺ نے اس کو جھڑک دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ تم کس بل بوتے پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ آیات۔ 17۔18۔ میں اس کا حوالہ ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس طریقے کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 3

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے قریب تر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو۔ اس لیے سجدہ میں بہت دعا کیا کرو ایک دوسری حدیث میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ سجدے کی حالت میں دعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

نفل نماز کے سجدہ میں دعا کرنا ثابت ہے۔ بعض احادیث میں یہ دعا کے خاص الفاظ بھی آئے ہیں۔ وہ الفاظ ماثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرض نمازوں میں اس طرح کی دعائیں ثابت نہیں ہیں کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے (معارف القرآن)۔ ہمیں بزرگوں نے یہ سکھایا تھا کہ نفل نماز کے سجدوں میں صرف وہ دعائیں مانگی جاسکتی ہیں جو قرآن مجید اور احادیث میں دی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ دعائیں مانگنی ہوں تو سلام پھیر کے استغفار اور درود شریف پڑھنے کے بعد مانگتے ہوئے سجدے میں چلے جاؤ، پھر جو چاہو مانگو، جس زبان میں چاہو مانگو۔ (مرتب)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ القدر (97)

آیت نمبر (1 تا 5)

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ	فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱	وَمَاۤ اَدْرٰىكَ	مَا
یقیناً ہم نے ہی اتارا اس (قرآن) کو	قدر کی رات میں	اور آپ کیا جانیں	کیا ہے

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲	لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ	مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳	تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ
قدر کی رات	قدر کی رات زیادہ بہتر ہے	ایک ہزار مہینوں سے	اترتے ہیں فرشتے اور وہ روح (جبریلؑ)

فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ	مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ﴿۴﴾	سَلٰمٌ ۛ هِيَ	حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۵﴾
اس (رات میں) میں اپنے رب کے اذن سے	ہر کام سے (کے ساتھ)	سلامتی ہے یہ (رات)	فجر کے طلوع ہونے کے وقت تک

نوٹ: 1

قدر کے ایک معنی عظمت وشرف (قدر و قیمت والا ہونا) کے ہیں۔ اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت ہے۔ قدر کے دوسرے معنی تقدیر کے بھی آتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لیے جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے، اس کا جو حصہ اس سال رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے، وہ ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو کائنات کے امور نافذ کرنے کے لیے مامور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ وہ فرشتے جن کو یہ امور سپرد کیے جاتے ہیں چار ہیں، حضرت اسرافیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت جبریلؑ۔

قرآن کریم کی تصریحات سے ثابت ہے کہ شب قدر ماہِ رمضان المبارک میں آتی ہے۔ مگر تاریخ کے تعین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے مگر آخری عشرہ کی کوئی خاص تاریخ متعین نہیں بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے اور وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے۔ اور ان میں سے طاق راتوں میں زیادہ احتمال ہے۔ اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہی ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی 83 سال سے زائد کی عبادت سے بھی بہتر ہے۔ پھر بہتر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ کتنی بہتر ہے دوگنی، چوگنی، دس گنی، سوگنی وغیرہ سب ہی احتمالات ہیں۔ (قیاس یہ کہتا ہے کہ حد مقرر نہ کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ بندے بندے کی عبادت میں اخلاص کی وجہ سے فرق ہوتا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنے کی خاطر حد کو کھلا چھوڑا گیا ہے۔ گویا فکر ہر کس بقدر ہمت اوست والی بات ہے۔ مرتب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شب قدر میں عبادت کے لیے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ شب قدر میں وہ تمام فرشتے جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ پر ہے، حضرت جبریلؑ کے ساتھ دنیا میں اترتے ہیں اور کوئی مومن مرد یا عورت ایسی نہیں جس کو وہ سلام نہ کرتے ہوں بجز اس کے جو شراب پیتا ہو یا سور کا گوشت کھاتا ہو۔ شب قدر میں بعض حضرات کو خاص انوار کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے، مگر اس رات کی برکات اور ثواب حاصل ہونے میں ایسے مشاہدات کا کچھ دخل نہیں ہے اس لیے اس کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس سورت کی پہلی آیت میں تصریح ہے کہ قرآن کریم شب قدر میں نازل ہوا۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا پھر جبریلؑ اس کو تدریجاً ۲۳ سال کے عرصے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تھوڑا تھوڑا لاتے رہے۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ نزولِ قرآن کی ابتدا اس رات میں چند آیتوں سے ہوگئی، باقی بعد میں نازل ہوتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صحفِ ابراہیم علیہ السلام تیسری رمضان میں تورات چھٹی رمضان میں، انجیل تیرھویں رمضان اور زبور اٹھارویں رمضان میں نازل ہوئی ہیں۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۵﴾ کا مطلب یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی برکات رات کے کسی خاص حصے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ غروب آفتاب سے طلوع فجر تک ایک ہی حکم ہے۔ جس شخص نے شب قدر میں عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے بھی اس رات کا ثواب پا لیا اور جو شخص جتنا زیادہ کرے گا اتنا زیادہ ثواب پائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر لی تو آدھی رات کے قیام کا ثواب پا لیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کر لی تو پوری رات جاگنے

عبادت کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

اختلاف مطالعہ (سورج طلوع ہونے کے وقت میں فرق) کی وجہ سے مختلف ملکوں اور شہروں میں شب قدر مختلف اوقات اور مختلف دنوں میں ہوتو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی، اُس جگہ اُسی رات میں شب قدر کے برکات حاصل ہوں گے۔ (معارف القرآن۔ ج ۸۔ ص ۷۹۱ تا ۷۹۴ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البینہ (98)

آیت نمبر (1 تا 5)

ترکیب

(آیت۔1) لَمۡ یَکُنِ میں کَانَ کا اسم اَلَّذِیۡنَ سے اَلۡمُشۡرِکِیۡنَ تک کا پورا فقرہ ہے اور مُنۡفَکِّیۡنَ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اَلۡمُشۡرِکِیۡنَ سابقہ مِنۡ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے۔ (آیت۔2) رَسُوۡلٌ کو اگر خبر مانیں تو اس سے پہلے اس کا مبتدا محذوف مانا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو فاعل مانیں اور اس سے پہلے فعل فَقَدۡ جَاءَ یا فَقَدۡ اَتٰی محذوف مانیں۔ دونوں صورتوں میں یہ پورا جملہ سابقہ اَلۡبَیِّنَۃُ کی وضاحت ہے۔ ترجمہ میں ہم دوسری صورت کو ترجیح دیں گے کیونکہ ایسی صورت میں آگے فعل مضارع یَتۡلُوۡا کو رَسُوۡلٌ کا حال ماننے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، جو زیادہ حسب حال ہے۔ صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً یہ پورا مرکب توصیفی نکرہ مخصوصہ ہے۔ اور آگے کا پورا جملہ اس کی خصوصیت ہے۔ (آیت۔3) کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ مبتدا مؤخر نکرہ ہے اس کی خبر موجودۃٌ محذوف ہے اور فِیۡہَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ اس میں ھَا کی ضمیر صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً کے لیے ہے۔ (آیت۔5) لِیَعۡبُدُوۡا پر لام کی نہیں بلکہ لام امر ہے اور یَعۡبُدُوۡا منصوب نہیں بلکہ مجزوم ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے کرنا ہوگا۔ مُخۡلِصِیۡنَ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے اور یہ اسم الفاعل ہے۔ اس نے الدِّیۡنَ کو نصب دی ہے۔ یُقِیۡمُوۡا اور یُؤۡتُوۡا سابقہ لِیَعۡبُدُوۡا کے لام امر پر عطف ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ مرکب اضافی ہے۔ اَلۡقَیِّمَۃِ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے دِیۡنُ کی صفت نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا موصوف یہاں محذوف ہے جو اَلۡمِلَّۃِ یا اَلرِّجَالِ ہوسکتا ہے۔

ترجمہ

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا	مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ	مُنۡفَکِّیۡنَ
تھے ہی نہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	مشرکین اور اہل کتاب میں سے	باز آنے والے (کفر سے)

حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ	الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾	رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ	یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾
جب تک کہ (نہ) پہنچے ان کے پاس	روشن دلیل	(تو آچکا ہے) ایک رسول اللہ کی طرف سے	پڑھتا ہوا ایسے پاکیزہ صحیفے

فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾	وَمَا تَفَرَّقَ	الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ	اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا
جن میں پختہ لکھی ہوئی باتیں (احکام) ہیں	اور الگ الگ نہیں ہوئے	وہ لوگ جن کو دی گئی کتاب	مگر اس کے بعد سے جو

جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ ۙ	وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا	لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ	مُخۡلِصِيۡنَ
آئی ان کے پاس واضح بات	اوران لوگوں کوحکم نہیں دیا گیاسوائے اس کے کہ	چاہیے کہ وہ لوگ بندگی کریں اللہ کی	خالص کرنے والے ہوتے ہوئے

لَهُ الدِّيۡنَ ۙ	حُنَفَآءَ	وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ
اسی کے لیے ضابطۂ حیات (دین) کو	یکسو ہوتے ہوئے	اور چاہیے کہ وہ لوگ قائم کریں نماز کو

وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ	وَذٰلِكَ	دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ ؕ
اور چاہیے کہ وہ لوگ پہنچائیں زکوٰۃ کو	اور یہ ہے	(لوگوں کا) پختہ ضابطۂ حیات (دین)

نوٹ:1 قرآن مجید کی ترتیب میں سورۃ البینہ کوسورہ علق اورسورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ سورۂ علق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی اوراس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

نوٹ:2 کفر میں مشترک ہونے کے باوجود اہل کتاب مشرکین، دونوں گروہوں کو دوالگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس انبیاء کی لائی ہوئی کتابیں تھیں اور مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی کے پیرو اور کسی کتاب کے ماننے والے نہ تھے۔ اگرچہ قرآن مجید میں اہل کتاب کے شرک کا بہت سے مقامات پر ذکر کیا گیا ہے لیکن قرآن میں کہیں بھی ان کے لیے مشرک کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصل دین تو توحید ہی کو مانتے تھے اور پھر شرک کرتے تھے۔ بخلاف اس کے غیر اہل کتاب کے لیے مشرک کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ اصل دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے اور توحید کو ماننے سے ان کو قطعی انکار تھا۔ یہ فرق ان دونوں گروہوں کے درمیان صرف اصطلاح میں ہی نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی۔ جبکہ مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے۔

نوٹ:3 آیت۔1۔ کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کے کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک روشن دلیل آکر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ عقل ہونا سمجھائے اور راہ راست کو واضح اور مدلل طریقے سے ان کے سامنے پیش کردے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس روشن دلیل کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجانے والے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں ان کا حالتِ کفر سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں سے کچھ لوگ اگر کفر پر قائم رہیں تو اس کی ذمہ داری پھر ان ہی پر ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4 کفر وشرک کی عالمگیر ظلمت کو دور کرنے کے لیے رب العالمین کی حکمت ورحمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ جیسے یہ مرض شدید اور عالمگیر ہے، اس کے علاج کے لیے ویسا ہی کوئی ماہر معالج بھیجنا چاہیے آگے اس ماہر حکیم کی صفت بیان کی کہ اس کا وجود ایک اَلۡبَيِّنَةُ یعنی روشن دلیل ہو۔ آگے فرمایا اس معالج سے مراد اللہ کا وہ رسول ہے جو قرآن کی واضح حجت لے کر ان کے پاس آئے۔ آگے قرآن کی چند اہم صفات کا بیان ہے۔

تلاوت کے معنی پڑھنے کے ہیں لیکن ہر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا بلکہ تلاوت اس پڑھنے کو کہتے ہیں جو پڑھانے والے کی تلقین کے بالکل مطابق ہو۔ کتاب اور صحیفہ تقریباً ہم معنی لفظ ہیں۔ لیکن کتاب کا لفظ حکم کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور قرآن میں بھی اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً الانفال۔68۔ اس جگہ بھی یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے مراد یہ ہے کہ یہ صحیفے جھوٹ، شک، نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں۔ آگے قَيِّمَةٌ کو اگر مستقیم کے معنی میں کتب یعنی احکام کی صفت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ احکام منصفانہ اور معتدل ہیں اور اگر اس کو مضبوط و مستحکم کے معنی میں لیں تو مطلب ہوگا کہ یہ احکام جو قرآن میں آئے ہیں قیامت تک قائم رہیں گے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔4۔ میں تفرق سے مراد وہ انکار و اختلاف ہے جو قرآن اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بارے میں اہل کتاب میں پیدا ہوا۔ اُن کی آسمانی کتب تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا، آپ ﷺ کی خاص خاص صفات کا اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہونے کا واضح ذکر موجود تھا۔ اس لیے کسی یہودی یا نصرانی کو اس میں اختلاف نہیں تھا کہ آخر زمانے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں گے، آپ ﷺ پر قرآن (اللہ کا کلام) نازل ہوگا اور آپ ﷺ ہی کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ مگر جب اللہ کا اَلْبَيِّنَه یعنی رسول آخر الزماں تشریف لے آئے تو ان میں افتراق پیدا ہو گیا کہ کچھ لوگ تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور بہت سے انکار کرنے لگے۔ یہ معاملہ چونکہ اہل کتاب ہی کے ساتھ مخصوص تھا اس لیے اس آیت میں صرف اہل کتاب ہی کا ذکر فرمایا ہے، مشرکین کو شامل نہیں کیا۔
(معارف القرآن)۔

آیت نمبر (6تا8)

ترکیب

اَلْمُشْرِكِيْنَ کے دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مِنْ پر عطف مانا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ (مِنَ) الْمُشْرِكِيْنَ۔ دوسرے یہ کہ اس کو اِنَّ پر عطف مانا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا۔ وَ(اِنَّ) الْمُشْرِكِيْنَ دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ یہ پورا فقرہ مبتدا ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ قائم مقام خبر ہے اور خٰلِدِيْنَ تفضیل کل (Superlative Degree) ہے۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر حصہ سوم، پیراگراف:٦:٦٢) اَلْبَرِيَّةِ دراصل فَعِيْلٌ کے وزن پر بَرِيْءٌ کا مونث بَرِيْئَةٌ ہے، اس کو اس طرح بھی پڑھتے ہیں اور ہمزہ کو یا میں تبدیل کر کے بَرِيَّةٌ بھی پڑھتے ہیں۔ (آیت۔8) جزاؤُهُمْ مبتدا ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ اس کی خبر نہیں ہے بلکہ متعلق خبر مقدم ہے اور جَنّٰتُ عَدْنٍ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	وَالْمُشْرِكِيْنَ
بیشک وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا	اہل کتاب میں سے	اور (بیشک) سب شرک کرنے والے
فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ	خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ	اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦
جہنم کی آگ میں ہیں	ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں	وہ لوگ ہی تمام مخلوق کے بدترین ہیں
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ	اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝٧
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے	اور اُنہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	وہ لوگ ہی تمام مخلوق کے بہترین ہیں

2029

جَزَآؤُهُمْ	عِنْدَ رَبِّهِمْ	جَنّٰتُ عَدْنٍ	تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
ان لوگوں کی جزا	ان کے رب کے پاس	عدن کے باغات ہیں	بہتی ہیں جن کے دامن سے نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ	رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
ایک حالت میں رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں ہمیشہ	راضی ہوا اللہ ان لوگوں سے

وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ	ذٰلِكَ لِمَنْ	خَشِيَ رَبَّهٗ ۧ ﴿۸﴾
اور وہ لوگ راضی ہوئے اس سے	یہ اس کے لیے ہے جو	مرعوب ہوا اپنے رب سے

نوٹ:1 آیت۔6۔ میں فرمایا کہ جو قرآن کی تکذیب کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں وہ سب جہنم میں بھر دیئے جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہے کہ وہ اس جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیے جائیں گے۔ یہاں اہل کتاب کے زعم پر نظر رہے کہ اول تو دوزخ کی آگ سے ان کو کوئی سابقہ پڑنے والا نہیں ہے اور اگر پڑا بھی تو وہ چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہوگا۔ آگے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿۶﴾ فرما کر ان کے غرور و تکبر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین کے سردار قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے شرط لگاتے تھے کہ جب تک کوئی فرشتہ آسمان سے نہیں اترے گا یا ایسی ہی دوسری شرائط لاتے کہ اس کے بغیر وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرائط وہ اس غرور کی بنا پر لگاتے تھے کہ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو جو دنیوی اعتبار سے ان سے کم تر بھی ہے، خدا کا رسول مان کر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں کس طرح ڈال لیں۔ ان کا یہ غرور قبولِ حق سے مانع بنا جس نے ان کو بدترین مخلوق بنا دیا۔

نوٹ:2 آیت۔8۔ میں اہل جنت کی سب سے بڑی نعمت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے خطاب فرمائیں گے یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ تو اہل جنت جواب دیں گے لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے هَلْ رَضِيْتُمْ۔ وہ جواب دیں گے اے ہمارے پروردگار اب بھی راضی نہ ہونے کا کیا احتمال ہے جبکہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دیا جو کسی مخلوق کو نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت دے دوں۔ پھر فرمائیں گے کہ میں نے اپنی رضا تمہارے اوپر نازل کر دی اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ اس حدیث میں اہل جنت سے پوچھا گیا ہے کہ آپ راضی بھی ہو۔ اور اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے ہر حکم اور ہر فعل سے راضی ہونا تو لازمۂ عبدیت ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، پھر یہاں اہل جنت کی رضا مندی کا ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے جواب یہ ہے کہ رضا کے عام مفہوم کے اعتبار سے رضاء بالقدر فرائض عبدیت میں سے ہے لیکن رضا کا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کی ہر مراد عطا کر دیں اور کوئی تمنا یا آرزو باقی نہ چھوڑیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3 سورت کے آخر میں وہ بات بتا دی جس پر تمام دینی کمالات اور آخرت کی نعمتوں کا مدار ہے اور وہ ہے اللہ کی خشیت۔ خشیت اس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دشمن، درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے بلکہ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت اور

جلال سے پیدا ہوا اور جس کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ ہر حال میں اس کی رضا جوئی کی فکر کرے اور ناراضی کے شبہہ سے بھی بچتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبد کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الزلزال (99)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترکیب

(آیت۔1 تا 3) بات اِذَا سے شروع ہو رہی ہے اس لیے ان آیات میں آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔4) تُحَدِّثُ کا مفعول اَخۡبَارَهَا بنفسہ آیا ہے۔ اس حوالے سے نوٹ کرلیں کہ حَدَّثَ کا مفعول بِ کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور بنفسہ بھی آتا ہے۔ (آیت۔5) قرآن مجید میں تقریباً ہر جگہ اَوۡحٰی کا مفعول الیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ یہ واحد مقام ہے جہاں اس کی ضمیر مفعولی ھا کے ساتھ لام کا صلہ آیا ہے۔ (آیت۔6) اَشۡتَاتًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ یَرَوۡا مضارع مجہول ہے جو ثلاثی مجرد اور باب افعال میں ہم شکل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ان میں پہچان کا ایک قرینہ موجود ہے۔ رَءٰی۔ یَرٰی (ثلاثی مجرد) کا ایک مفعول آتا ہے، کسی کو دیکھا۔ جبکہ اَرٰی۔ یُرِیۡ (باب افعال) کے دو مفعول آتے ہیں، کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں یُرَوۡا میں شامل ھم کی ضمیر نائب فاعل (یعنی مفعول اوّل) موجود ہے۔ آگے اَعۡمَالَهُمۡ اس کا مفعول ثانی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہاں یُرَوۡا باب افعال کا مضارع مجہول ہے۔ (آیت۔7) مَنۡ شرطیہ ہے۔ اس لیے یَعۡمَلۡ مجزوم آیا ہے۔ یَرٰی جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا تو اس کی یا گر گئی۔ ترجمہ جملہ شرطیہ کے لحاظ سے ہوگا۔ یَعۡمَلۡ کا مفعول خَیۡرًا ہے جو نکرہ مخصوصہ ہے۔ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ اس کی خصوصیت مقدم ہے۔

ترجمہ

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ	زِلۡزَالَهَا ۙ﴿۱﴾	وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ	اَثۡقَالَهَا ۙ﴿۲﴾
جب ہلایا جائے گا زمین کو	جیسے اس کو ہلا مارنے کا حق ہے	اور نکال ڈالے گی زمین	اپنے سارے بوجھ

وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ	مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾	یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ	اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾	بِاَنَّ رَبَّكَ
اور کہے گا انسان	اس کو کیا (ہو گیا) ہے	اُس دن وہ بیان کرے گی	اپنی خبریں	(یہ) اس سبب سے کہ آپؐ کے رب نے

اَوۡحٰی لَهَا ؕ﴿۵﴾	یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ	اَشۡتَاتًا ۙ	لِّیُرَوۡا	اَعۡمَالَهُمۡ ؕ﴿۶﴾
الہام کیا اس کو	اس دن واپس ہوں گے لوگ	الگ الگ ہوتے ہوئے	تا کہ ان لوگوں کو دکھایا جائے	ان کا سب کیا دھرا

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ	مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا	یَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾	وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ
پس جس نے (بھی) عمل کیا	کسی ذرہ کے ہم وزن کسی بھلائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو	اور جس نے (بھی) عمل کیا

مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا	یَّرَهٗ ﴿۸﴾
کسی ذرہ کے ہم وزن کسی برائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو

نوٹ: 1 اس میں اختلاف ہے کہ یہاں جس زلزلہ کا ذکر ہے، یہ وہ زلزلہ ہے جو نفخہ اولیٰ (پہلا صور پھونکے جانے) سے پہلے دنیا